Urdu Studies
An international, peer-reviewed, bilingual research journal
ISSN: 2583-8784 (Online)
Vol. 5 | Issue 1 | Year 2025
Pages: 140-145

فارسی کلاسیکی شاعری کا دائمی سحر

این میری شمل

ترجمہ: اخلاق احمد آہن

مشرقی اسلامی زندگی کا خوبصورت ترین پہلو یہ ہے کہ اب بھی لاکھوں افراد اپنی ادبی وراثت سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ عموماً یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی مسلم ملک کا کوئی وزیر قانون یا کوئی فائنانس سکریٹری، ترکی فوج کا کوئی افسر یا پاکستان میں کیمسٹری کا کوئی پروفیسر فارسی، ترکی یا اردو ادب کے لا محدود ذخیرے میں سے کوئی شعر پیش کرتا ہے اور وہاں موجود دوست احباب بڑی رغبت سے اس ادبی گفتگو میں شامل ہو جاتے ہیں اور ہر شخص اس خالص شعری لطف کو دوبالا کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے جو صدیوں پر مشتمل مشاہدات اور عقل و دانش کی باتوں سے لبریز ہے۔ اس ادبی روایت کا مشاہدہ گاؤں اور چھوٹے شہروں، قصبوں میں بھی ہوتا ہے جہاں ان پڑھ افراد بھی شعروں، گیتوں، اساطیری داستانوں اور پہیلیوں کی شکل میں موجود اپنے سیکڑوں سال قدیم ادب کے پاسدار ہیں اور مغرب کا کوئی شخص یہ دیکھ کر دم بخود رہ جاتا ہے کہ اسلامی روایات و واقعات کی طرح معمولی نوعیت کے عوامی گیتوں اور نغموں میں محفوظ ہیں۔ حتی کہ سندھ کے دور دراز غیر معروف مقامات کے لوگ

ISSN: 2583-8784 (Online)
Included in UGC-CARE List since October 2021
Published on August 15, 2025
http://www.urdustudies.in
https://creativecommons.org/licenses/by-nc-nd/4.0/?ref=chooser-v1

بھی صوفی حلاج کی شہادت اور اسی طرح مجنوں و فرہاد، جمشید و سلیمان کے واقعات سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ یہ ان کے شعری سرمائے اور عام گفتگو کا جزو لا ینفک ہیں۔

شاعری کے معاملے میں مغرب کبھی بھی مشرقی دنیا کی طرح حساس نہیں رہا لیکن ہمارے عہد میں شاعری کے ساتھ وابستگی، خواہ وہ کلاسیکی شاعری ہو یا جدید، روز بروز کم ہوتی جارہی ہے خدشہ ہے کہ مشرقی ممالک میں بھی جدید ٹکنالوجی اور مغربی طرز فکر کے بڑھتے اثرات کے نتیجے میں اپنے ادب کے ساتھ یہ لگاؤ آنے والے دنوں میں سرد پڑ جائے گا جو مسلمانوں کے رگ وریشے میں رچابسا ہوا ہے۔ ہم ایسے کتنے ہی عرب دوستوں کو جانتے ہیں جو سارتر (Sartre) یا بریخت (Brecht) کی تخلیقات کا حوالہ دیتے ہوں مگر جنہوں نے کبھی کوئی کلاسیکی عربی شعر نہ پڑھا ہو اور نہ جنہیں ترکی یا اردو تو دور فارسی کے بڑے شعراء سے واقفیت ہو۔ انہیں زیادہ سے زیادہ حافظ یا عمر خیام سے صرف نام کی حد تک آگاہی ہو اور وہ بھی انگریزی کے حوالوں سے۔ جدید شاعری روایتی شعری وراثت سے اپنے رشتے توڑنے کے لیے کوشاں رہی ہے اور یہ بات بڑی حد تک قابل فہم بھی ہے کیوں کہ ہر ادبی تحریک لازمی طور پر اپنے عہد کے مسائل کو اسی عہد کے استعاروں اور علائم کے وسیلے سے پیش کرتی ہے، لیکن اس کے باوجود، یہ سوال اپنی جگہ ہے کہ فارسی کی کلاسیکی روایت کس حد تک، اپنے وسیع تر معنوں میں، جس میں ترکی اور برصغیر ہند کا فارسی سے متاثرہ ادب بھی شامل ہے، جدید ادب کی تعمیر میں بروئے کار لائی جاسکتی ہے۔ یہ سوال بھی ہے کہ جدید تحقیق کس حد تک کلاسیکی شاعری کی بنیادی خصوصیات کی نشاندہی میں کامیاب ہو سکی ہے جس کی اکثر وبیشتر غلط تشریح ہوئی ہے۔

ایک مغربی مستشرق کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ آج ہم ایک دو نسل قبل کے یوروپی مستشرقوں کے مقابلے میں کلاسیکی فارسی شاعری کے حسن وزیبائی کی تفہیم کی زیادہ بہتر صلاحیت رکھتے ہیں۔

اٹھارویں صدی میں فارسی اور عربی شاعری کی ابتدائی تشریح و تعبیر کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ اس دور کے اسکالر عام طور سے یونانی اور رومن کلاسیکی شاعری سے اس کا موازنہ کرنے لگ جاتے تھے،

جب کہ حافظ اور ہوریس (Horace) کی شاعری ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے۔ لیکن فارسی شاعری کی تفہیم میں اس سے بھی خطرناک پہلو یہ تصور تھا کہ اسے Erlebnisdichtung کے پر قبول کیا جائے یعنی یہ کہ شعر شاعر کی زندگی کے کسی ایک اور نا قابل فراموش واقعے کے نتیجے میں معرض وجود میں آتا ہے اور یہ اس کے خالص ذاتی جذبات واحساسات کا نہایت ذاتی نوعیت کی زبان میں بڑا ہی انفرادی اظہار ہوتا ہے۔ شعر کا یہ تصور جرمنی میں ہیئت پرست بیروک شاعری کے برعکس کلاپسٹاک (Klopstock) کی شاعری اور انگلینڈ میں رومانٹک دور کے بعد سے بنیادی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مذکورہ ادبی افکار و نظریات کے تحت جرمن زبان اور کچھ دوسری یوروپی زبانوں میں حافظؔ کے دیوان کے جو ترجمے ہوئے ہیں وہ انتہائی افسوسناک حد تک بدمزہ ہیں کیوں کہ یہ ترجمے مشرقی شاعری کی ان اساسی خصوصیات کی تفہیم سے یکسر خالی ہیں، جنہیں گوئٹے اپنی غیر معمولی بصیرت کی بنیاد پر Das Geistreiche یعنی روحانی دانش ورانہ قوت سے تعبیر کرتا ہے (یہاں wit انگریزی کے میٹافیزیکل / مابعد الطبیعیاتی شعرا کی wit کے معنی میں استعمال ہوا ہے)۔ علاوہ ازیں مترجمین یا ادبیات کے مورخین نے ان اصناف کے فنی محاسن اور "صناعاتی" (Rhetorical) عنصر کو یا تو پوری طرح نظر انداز کر دیا یا اسے فارسی شاعری کی ناپسندیدہ کمزوری قرار دے کر ایک طرف کر دیا۔ نتیجتاً حافظ کے اشعار میں شراب و ساقی، ملا اور صوفی کے استعاروں کو جو شروع ہی سے بار بار استعمال کئے جاتے رہے ہیں کسی حقیقی ذہنی حالت یا واقعات کا واقعاتی اظہار سمجھ لیا گیا۔ فریڈرک رخرٹ (Fredrick Ruckert) واحد مستشرق ہے جو فارسی شاعری کی انتہائی صناعانہ خصوصیات کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ عربی سے لے کر سنسکرت تک تمام مشرقی زبانوں کے اشعار کے جرمن زبان میں بے مثال ترجمے کرنے میں کامیاب رہا ہے لیکن اس کے ان ترجموں کو عوامی مقبولیت نہیں مل سکی۔ یہ افسوس ناک بات ہے کہ فارسی اور اردو شاعری کو یورپ کے داخلی ادبی معیاروں سے دیکھنے کی روش خود ادب کے معاصر مسلم اسکالروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ حالاں کہ یورپ اور امریکہ میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے تنقیدی تصورات نے ادبی نقادوں کی توجہ صناعی (Craftmanship) اور روایتی عناصر کی اہمیت کی طرف مبذول کرائی ہے جو

ہمارے عہد میں، جب آرٹ میں رومانی رویے پہلے کی طرف بامعنی نہیں رہ گئے ہیں، شاعری کرنے کے لیے ضروری ہیں۔

کلاسیکی فارسی شاعری کے لیے لفظ مصنوعی (Artificial) کے استعمال سے اس کے کمال خوبی کو کمتر دکھانا قطعاً مقصود نہیں ہے بلکہ یہی خصوصیت ایرانی مصوری کے نمونوں میں بھی بہ درجہ اتم پائی جاتی ہے۔ ان میں بھی مصور کے ذاتی فکر و احساس کی ترجمانی نہیں ہوتی بلکہ یہ کچھ معروف علامتوں اور پیروں تک محدود ہیں مثلاً غسل شیریں یا مجنوں کی غزالوں سے گفتگو۔ لیکن فنکار کا دست کمال و مہارت ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اپنے اس انداز کے ساتھ کہ وہ کس طرح عاشق کی قمیص میں ایک شکن کو نمایاں کرتا ہے یا تالاب کے کنارے درختوں میں ایک پرندے کا اضافہ کر دیتا ہے یا معشوقہ کے نازک ہاتھوں کو تھوڑے مختلف زاویے سے دکھا دیتا ہے جس سے تصویر کی اظہاری قوت دوچند ہو جاتی ہے۔ وہ تصویر کے نقش و نگار میں تبدیلی نہیں لاتا لیکن اس کے موقلم کی فن کارانہ جنبش کا کمال تمام لطیف ترجزئیات کے دروبست سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہی بات خطاطی پر بھی صادق آتی ہے کہ کسی خطاط کی برسوں کی محنت اور کاوش بے داغ حسن تحریر کے ساتھ الف لکھ دینے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ شاعر کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے جو کسی خاص مضمون کو زیادہ سے زیادہ صناعی اور لطافت کے ساتھ بروئے کار لا کر شعر کہتا ہے۔ ایک خاص وزن کا انتخاب، مخصوص الفاظ اور پیکروں کو ترجیح یا منتخب وزن میں ایک خاص "داخلی" تناسب کا التزام، کسی خاص آواز یا حروف علت کا اہتمام جس سے وہ شعر میں تازہ اور حیرت انگیز دلکشی پیدا کر دیتا ہے حالاں کہ اس کے شعر کا مضمون وہی ہوتا ہے جسے پانچ سات سو برس سے مختلف شعراء اپنے اپنے انداز میں بیان کرتے رہے ہیں۔ اگرچہ کسی شاعر کے اشعار سے اس کے روحانی یا ذہنی ارتقا کا اندازہ کرنا تقریباً محال ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اشعار ذاتی تجربات سے خالی ہوتے ہیں یا روایتی ہیئتوں یا اصناف کی قید و بند کے سبب شخصی احساسات کے اظہار کی راہیں مسدود ہو کر رہ جاتی ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کلاسیکی فارسی غزل عطر گلاب کی طرح ہزاروں گلابوں سے معطر ہو کر عالم وجود میں آتی ہے۔ یہ اشعار استاد شعراء کے گہرے اور شدید جذبات و

احساسات میں تپ کر تخلیق ہوئے ہیں جن کی واضح طور پر نشاندہی نہیں کی جاسکتی بلکہ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

یہ غزل کا غیر شخصی کردار ہے جو نقاب کی طرح محبوب کے چہرے کو چھپا دیتا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے حسن کے عکس اس پردے سے چھنتے بھی رہتے ہیں (گوئٹے کے مطابق یہ غزل کی اپنی مخصوص دلکشی ہے) اور یہی خوبی اسے دوام بخشتی ہے۔ اگر اس زمانے کے شاعر نے اپنے خاص اسلوب میں اپنے ذاتی احساسات کو اپنے عہد میں وضع کردہ استعاروں کے توسط سے شعر کے قالب میں ڈھالا ہوتا تو ہم اس کے شعر سے محظوظ نہ ہو پاتے اور نہ اس سے گہری مطابقت پیدا کر پاتے لیکن چونکہ شاعر نے اپنے ذاتی تجربات کو بدیع و بیان کے سخت اصولوں کے غیر شخصی وسیلے سے ظاہر کر کے انہیں سب کے لیے قابل فہم بنا دیا ہے اس لیے ہم کلاسیکی علامات کو اپنے طور پر زندہ کر کے شاعر کے عشق، اس کے دکھوں اور اس کی مسرتوں میں شریک ہو سکتے ہیں۔

بلاشبہ صناعی اور پیچیدہ بیانی، بے لطفی، پھسپھسے پن، بلاضرورت تکرار، متقدمین شعراء کی زمین میں زور آزمائی کر کے ان سے آگے بڑھنے کی کوشش میں بے روح لفاظی کی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہے، لیکن اس کے باوجود ادبی تاریخ میں روایتی فنی رویوں، مخصوص استعاروں اور پیکروں کے ارتقاء پر گہری نگاہ ڈالی جائے تو کئی نئے پہلو روشن ہوتے ہیں حالانکہ ان کی وجہ سے غزل ایک طرح سے جمود کی شکار بھی ہوئی ہے۔ مثلاً ایک نامراد عاشق فرہاد کوہ کن جدید ادب میں دبے کچلے مزدور کی علامت بن کر ابھرا ہے۔ اسی طرح حلاج شہید جو اپنے شوریدہ عشق کے نتیجے میں تختہ دار پر چڑھا دیا گیا اور جو صوفی حلقوں میں صدیوں سے عشق کی عظیم علامت بن کر رہا ہے، عصر حاضر میں بھی ایک آزادہ رو عاشق کی علامت کے طور پر قبول کر لیا گیا جو ارباب اقتدار کے ہاتھوں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح گل و بلبل کی داستان عشق جو ہزاروں برس سے مسلسل دہرائی جاتی رہی ہے کیا واقعی محض مضمون آرائی اور قافیہ پیمائی سے زیادہ کچھ نہیں یا اس میں لافانی عشق کے اسرار و رموز کی تلاش بھی کی جاسکتی ہے، ایک ہجر زدہ روح کا عشق جو گل کی علامت سے ظاہر ہونے والے ابدی حسن پر فریفتہ ہے۔ پرندہ روح انسانی کی

مذہبی زندگی کی سب سے قدیم علامت رہا ہے اور نہ صرف مسیحی بلکہ مسلم صوفیوں نے بھی خدا کے جلال و جمال کو گل سرخ کی تابانی کے حوالے سے دیکھا ہے۔ عشق، موت، آرزو، مایوسی، ناامیدی میں امید جیسے دائمی انسانی تجربات ان بظاہر فرسودہ علامات میں روپوش ہیں جو صدیوں سے فارسی، اردو، ترکی شاعری میں استعمال ہو رہی ہیں۔ ان کے اصل مفہوم کی تلاش ہی کلاسیکی شاعری کے جدید مطالعے کا سب سے پر لطف پہلو ہے۔ نئی نسل کو اپنے نئے استعاروں کی تلاش کرنی ہے لیکن ابراہیم کی علامت جن کے لیے آتش نمرود گلزار بن گئی تھی آج کے ایٹم بم اور کمپیوٹر کے عہد میں بھی ایک مومن، سچے عاشق اور آدرش پرست انسان کے لیے اتنی ہی بامعنی اور سچی ہے جتنی تیرہ سو سال پہلے تھی۔

مراجع:

Schimmel, Annemarie. *A Two-Colored Brocade: The Imagery of Persian Poetry*. The University of North Carolina Press, 1992.

شمل، انا ماری۔ "فارسی شاعری کا دائمی سحر"۔ ترجمہ اخلاق احمد آہن۔ اسلام اور عصر جدید، جنوری-اپریل ۲۰۰۳، ۱۹۵-۲۰۰۔